بقصد ضرار کیا جائے۔"

حاشیے میں احکام القرآن لابن عربی جلد اول صفحہ ۷۵، اور بدایۃ المجتہد لابن رشد جلد دوم صفحہ ۹۸ کا حوالہ درج کر دیا جائے۔

پاکستان میں قانون سازی کا رجحان جس سمت کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے وُہ اب ہر اُس شخص کے لیے باعثِ تشویش بن گیا ہے جو حق اور انصاف کو عزیز رکھتا ہے، اور اس ملک کی خیر چاہتا ہے۔ اگر مسلمان کی نظر سے دیکھا جائے تو قانون کی صحت کا معیار وہ اصول ہیں جو اسلام نے ہم کو دیے ہیں۔ اور اگر نامسلمان کی نظر سے دیکھا جائے تو پھر قانون کی صحت کا معیار وہ عقلِ عام ہے جو انصاف کے چند معروف اور عالمگیر اصولوں کو سمجھتی اور سمجھتی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں جس قسم کے قوانین بن رہے ہیں (خواہ وہ مجالسِ قانون ساز کی معرفت بنے ہوں یا "فرمانوں" کے ذریعہ سے ملک پر مسلط کیے گئے ہوں) اُن کو دیکھیے تو وہ نہ اسلام ہی کے اصولوں پر پورے اترتے ہیں اور نہ انصاف کے اُن معروف اصولوں پر جنہیں عقلِ عام جانتی ہے۔ اس رفتار کو روکنا سخت ضروری ہے، قبل اس کے کہ یہ فتنے اور خطرے کی انتہا تک پہنچے۔

اس سلسلے میں ہم اُن چند نمایاں خصوصیات کا جائزہ لیں گے جو پنجاب کی مجلسِ قانون ساز کے منظور کردہ قوانین اور مرکزی حکومت کے نافذ کردہ فرمانوں میں مشترک طور پر پائی جاتی ہیں۔

ان کی پہلی نمایاں اور سخت مکروہ خصوصیت یہ ہے کہ ہر ایسا قانون، جس میں نظم و نسق اور اس کے کارپردازوں کو عوام الناس کے شخصی حقوق پر دست درازی کرنے کے غیر معمولی اختیارات دیے گئے ہیں، ساتھ ساتھ بالالتزام ایک دفعہ اس مضمون کی بھی رکھتا ہے جس میں تصریح کر دی گئی ہے کہ ملک کی عام عدالتیں ان اختیارات کے استعمال سے متعلق لوگوں کی کسی شکایت کی نہ سماعت کر سکتی ہیں، نہ ان پر کوئی فیصلہ دے سکتی ہیں۔ ہم نے دقّتِ نظر سے جائزہ لے کر دیکھا اور اس خصوصیت سے کسی قانون اور کسی آرڈی نینس کو خالی نہ پایا۔

سوال یہ ہے کہ ہمارے منتظمین حکومت نے یہ اصول کہاں سے اخذ کیا ہے؟ اگر یہ اسلام سے ماخوذ ہے تو ہم بڑے شکر گزار ہوں گے اگر قرآن و حدیث کے اُن ارشادات کی نشان دہی کر دی جائے جن سے یہ اصول اخذ کیا گیا ہے۔ اور اگر یہ عقلِ عام سے ماخوذ ہے تو ذرا ہمارے اربابِ حکومت وہ دلائل ارشاد فرمائیں جو اس اصول کی تائید میں ان کے پاس موجود ہیں، تاکہ ہم بھی دیکھ سکیں کہ اس کا ماخذ واقعی عقلِ عام ہی ہے یا کوئی عقلِ خاص۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ منتظمین حکومت کو آخر اس پر اس قدر اصرار کیوں ہے کہ جو قانون بھی وہ بناتے ہیں اس میں لازماً اس مضمون کی ایک دفعہ رکھ دیتے ہیں؟ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ ملک کی عدالتیں ناقابلِ اعتماد ہیں؟ اگر یہ بات ہے تو براہِ کرم پبلک کو بھی ایسی عدالتوں سے نجات دلائیے اور رخصت کیجیے ان سارے منصفوں اور مجسٹریٹوں کو۔ لیکن اگر یہ بات نہیں ہے تو پھر کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ باشندگانِ ملک کو اپنا مملوک سمجھتے ہیں اور وہ اختیارات چاہتے ہیں جو قدیم زمانے میں آقاؤں کو اپنے غلاموں پر حاصل تھے؟

دوسری نمایاں خصوصیت ان کے اندر یہ پائی جاتی ہے کہ جس معاملہ میں بھی حکومت اور پبلک کے درمیان نزاع کے عدالتی فیصلے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے، اُس میں یہ ضرور تجویز کیا گیا ہے کہ عام ملکی عدالتوں کے بجائے خاص عدالتیں، ٹریبونل، اس کے لیے بنائی جائیں گی، جن کا تقرر ظاہر ہے کہ خود حکومت ہی کرے گی۔

غور کیجیے کہ اس کے معنی کیا ہیں؟ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ مقدمے کا ایک فریق ہر اُس جج کے سامنے جانے کے لیے تیار نہیں ہے جو عام لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرنے کے لیے عدالت کی کرسی پر بٹھایا گیا ہے، بلکہ اسے اس بات پر اصرار ہے کہ میں خود جس جج کا انتخاب کروں اس کے سامنے مقدمہ جائے اور فریقِ ثانی اُسی کا فیصلہ ماننے پر مجبور ہو —— سوال یہ ہے کہ آخر مقدمے کے ایک فریق کو یہ ترجیحی حق کس بنا پر حاصل ہوا ہے؟ اس کا ماخذ اسلام ہے؟ یا عقلِ عام؟ یا درحقیقت یہ اس بات کی سزا ہے کہ فریقِ ثانی نے کیوں آپ کو ووٹ دے کر اقتدار کی مسند پر بٹھانے کی حماقت کی؟

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ انتظامی حکومت اور اس کے کارکنوں کو وسیع سے وسیع تر اختیارات دینے کا

رجحان ہمارے قوانین میں روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے، اور یہ اس صورت میں اور بھی زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے جبکہ بالعموم پبلک کے لیے عدالتوں سے فریاد کرنے کا راستہ قانوناً بند کر دیا جائے اور عدالتی فیصلے کے لیے خاص عدالت کی شرط لگا دی جائے۔ ان وسیع اور غیر معمولی اختیارات کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:-

پنجاب کا قانون مصائب قومی، ریلیف کمشنر کو یہ اختیارات دیتا ہے کہ آفت رسیدہ علاقے میں جس کی جو چیز چاہے طلب کرلے، خواہ وہ زمین ہو، عمارت ہو، سامان ہو، سواری ہو یا کچھ اور۔ جس عمارت کو چاہے توڑ دے۔ جس کو چاہے جبری خدمت کے لیے بلالے۔ جس کو چاہے کسی کام سے روک دے یا کسی حکم کا پابند بنائے۔ وہ اپنے احکام کی تعمیل کرانے کے لیے ہر طرح کی قوت استعمال کرنے کا مجاز ہے۔ وہ اپنے یہ وسیع اختیارات اپنے ماتحتوں میں سے جس کو چاہے تفویض کرسکتا ہے۔ اس کے احکام کی خلاف ورزی فوجداری جرم، قابل دست اندازی پولیس ہے۔ مگر وہ خواہ کوئی بھی زیادتی کر جائے، اس کے کسی حکم کے خلاف نہ تو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا جاسکتا ہے، اور نہ کسی نقصان کی تلافی کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے۔

نقصان رسیدہ علاقوں کی اصلاح کے لیے پنجاب میں جو قانون بنایا گیا ہے وہ حکومت کو اختیار دیتا ہے کہ وہ جس علاقے کو چاہے نقصان رسیدہ قرار دے کر امپروومنٹ ٹرسٹ کے حوالے کر دے۔ "نقصان رسیدہ" کی کوئی تعریف نہیں کی گئی جس سے معلوم ہو کہ اس اصطلاح کے معنی کیا ہیں اور کس قسم کے علاقے کو اس سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔ امپروومنٹ ٹرسٹ اس علاقے کی اصلاح کے لیے جو اسکیم بنائے اس کو عمل میں لانے کے لیے وہ جس زمین یا مکان کو چاہے بیع، پٹہ، تبادلہ، یا کسی اور طرح حاصل کرسکتا ہے۔ جس عمارت یا حصۂ عمارت کو چاہے گرا سکتا ہے جس مکان یا جھونپڑی کو چاہے دو دن کے نوٹس پر خالی کرا سکتا ہے، بغیر اس کے کہ اس کے مکینوں کو کوئی دوسرا ٹھکانا دلوانے کی ذمہ داری اُس پر یا کسی اور پر عائد ہوتی ہو۔ اور اس سلسلہ میں جو چیز بھی حاصل کی جائے اُس کا معاوضہ مشخص کرنے کا اختیار قطعی طور پر حکومت کے اُس افسر کو دے دیا گیا ہے جو ضلع میں جائدادوں کی تحصیل کے لیے کلکٹر مقرر کیا گیا ہو۔ جو شخص اس معاملہ میں کسی طور پر امپروومنٹ ٹرسٹ کی مزاحمت کرے، اس کو دو سال تک قید کی سزا دی جاسکتی ہے۔ مگر خود اس شخص کے لیے کسی زیادتی کے خلاف عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کا کوئی موقع نہیں ہے۔

زیادہ سے زیادہ بس وہ معاوضے کا مسئلہ عدالت میں لے جا سکتا ہے، مگر عام عدالت میں نہیں بلکہ ٹریبونل میں۔

جنگلی جانوروں کی حفاظت کے لیے پنجاب میں جو قانون بنایا گیا ہے وہ ہر پولیس افسر کو، یا ہر اُس شخص کو جسے حکومت اس کام پر مقرر کرے، یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ جسے چاہے اس قانون کی خلاف ورزی پر بلا وارنٹ گرفتار کر لے۔

چوتھی خصوصیت اِن نوساختہ قوانین کی یہ ہے کہ ان میں شریعت کے قطعی احکام کی خلاف ورزی کا سلسلہ حسبِ سابق جاری ہے۔ مثال کے طور پر ابھی ابھی جو زرعی اصلاحات کا قانون پنجاب میں پاس کیا گیا ہے اُس میں واضح طور پر یہ الفاظ موجود ہیں کہ حکومت جن موروثی کاشتکاروں کو زمینوں کا معاوضہ ادا کرنے کے لیے قرض دے گی، ان سے سود وصول کرے گی۔ اسی طرح سود کے معاملے کی تصریح نقصان رسیدہ علاقوں کی اصلاح کے قانون میں بھی موجود ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے اربابِ حکومت اپنی نئی قانون سازی میں بھی اسلامی احکام کی پروا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، کجا کہ ان سے یہ امید کی جائے کہ وہ پچھلے دَور کے قوانین کو بھی اسلامی اصولوں پر ڈھالنے کی کوشش فرمائیں گے ؟

ایک اور عجیب خصوصیت اِن قوانین میں یہ پائی جاتی ہے کہ اِن میں بڑی بیفکری کے ساتھ صریح غیر معقول دفعات شامل کر دی گئی ہیں اور اس بات کی بالکل پروا نہیں کی گئی کہ غیر معقول احکام سے نہ صرف قانون کا احترام دلوں سے اُٹھ جاتا ہے، بلکہ اُس ریاست کی عزت پر بھی حرف آتا ہے جس کے قوانین ایسے احکام پر مشتمل ہوں۔ ذیل کی چند مثالیں صرف ایک قانون سے لی گئی ہیں جو پنجاب میں زرعی اصلاحات کے لیے منظور ہوا ہے:

(۱) مالکانِ زمین کو جو رقبہ خود کاشت کے لیے اپنے پاس رکھنے کی اجازت دی گئی ہے، اس کو یا اس کے کسی حصے کو وہ خود اپنی زمین کے کسی رقبے سے اُس وقت تک نہیں بدل سکتے جب تک کہ ان کے خود کاشت رقبے کا کم از کم ۵۰ فیصدی حصہ سیم یا تھور سے ناقابلِ کاشت نہ ہو گیا ہو۔ البتہ اگر اسی زمین کا ایک فی صدی حصہ بھی دریا برد ہو جائے، یا حکومت اپنے کسی کام کے لیے حکماً حاصل کر لے تو وہ اس کے بقدر دوسرا کوئی رقبہ اپنے

خود کاشت رقبے میں شامل کر سکتے ہیں۔

(۲) جو زمین اس قانون کے نفاذ سے پہلے باغبانی کے لیے استعمال ہو رہی تھی وہ قابلِ کاشت کی تعریف میں نہ آئیگی، اور مالک زمین اس کے علاوہ ۵۰ ایکڑ اپنی خود کاشت کے لیے مخصوص کر سکیگا۔ لیکن جو زمین اس قانون کے نفاذ کے بعد اسی مقصد کے لیے استعمال کی جائے وہ قابلِ کاشت سمجھی جائے گی اور اسے بھی خود کاشت رقبے میں شمار کیا جائے گا۔

(۳) جو زمین کاغذاتِ مال میں "بنجر قدیم" لکھ دی گئی ہے، قانون اُسے بنجر ہی سمجھتا رہیگا خواہ وہ عملاً قابلِ کاشت ہی کیوں نہ بنالی گئی ہو۔

(۴) زمینداروں کے لیے از روئے قانون یہ طے کیا گیا ہے کہ وہ بٹائی میں ۴۰ فی صدی سے زیادہ حصہ نہیں لے سکتے، لیکن صاف لکھ دیا گیا ہے کہ خود گورنمنٹ جن زمینوں کی مالک ہے ان پر وہ اپنے کاشت کاروں سے بٹائی لینے میں اس قانون کی پابند نہ ہوگی۔ بالفاظ دیگر انصاف کے دو معیار ہیں، ایک حکومت کے لیے، دوسرا لوگوں کے لیے۔

(۵) جو موروثی مزارعین اب تک بٹائی پر کاشت کر رہے تھے وہ بلا معاوضہ اپنی بٹائی کے بقدر حصے کے مالک بن جائیں گے۔ مگر جو نقد لگان ادا کر رہے تھے اُن کو مالک بننے کے لیے معاوضہ دینا پڑیگا۔

اس کے علاوہ ان قوانین میں ایک اور سخت مذموم رجحان یہ بھی پایا جاتا ہے کہ باشندوں کے درمیان انصاف اور قانون میں مساوات ملحوظ رکھنے کے بجائے ان کو مختلف طبقات میں تقسیم کیا جا رہا ہے، اور مختلف طبقوں کے لیے انصاف کے الگ معیار بنائے جا رہے ہیں۔ کہیں عوام اور ان کے نمائندوں کے درمیان خطِ امتیاز کھینچا گیا ہے۔ کہیں زمینداروں کو دو مختلف طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کہیں کاشت کاروں کے کئی طبقے بنا دیے گئے ہیں۔ اور پھر ان مصنوعی تقسیمات کے ساتھ ہر ایک طبقے کے حقوق اور امتیازات الگ الگ معیاروں کے لحاظ سے مقرر کیے گئے ہیں۔ ان کارروائیوں کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ پھر اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا کی ایک عملی تفسیر شروع ہوئی ہے۔